جہاد: نیا تناظر، نئے سوالات

عبدالحق ہاشمی*

ABSTRACT:

"The status of Jihaad in Islam, its significance, and its necessity in various circumstances does not go unobserved by any person of intellect; it remains a fact that according to the Prophet of Islam, Mohammed (salla'Allahu alaihi wa'sallam), Jihaad will continue to the Day of Judgment. In every age, a few individuals and groups would, inspite of the arrogance and false distortions of their opponents, keep this undertaking alive, there is no doubt to the reality that the acts of eradicating brutality from the world, crumbling tyrannical tactics and malice of imperious rulers to dust, have all been accomplished with this very practice of Jihaad. Only with it did humanity acquire peace and harmony, with sanctity of their honour, esteem, lives, and wealth…"

"In the chapter of Jihaad, this fact is also proven that the rules and bounds the Prophet of Blessing (salla'Allahu alaihi wa'sallam) drew for the battlefield in terms of moral codes in his life were hitherto unknown in the barbarous societies before Islam. It was the fruit of these lines drawn on the basis of humanity, compassion and justice that hearts were won even in the battleground. The authentic sayings of the Prophet (salla'Allahu alaihi wa'sallam) utterly prohibit disgraceful acts commonly practiced in the battle, such as causing commotion, looting, unnecessary obliteration, breaking contracts, arson, and mutilating corpses."

دین اسلام میں جہاد کا مقام، اہمیت وفضیلت اور مختلف حالات میں اس کی ضرورت کسی صاحبِ نظر سے مخفی نہیں(۱)، یہ بات بھی واضح ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے ارشاد گرامی کے مطابق جہاد تا قیامت جاری رہے گا، ہر زمانے میں کچھ افراد اور گروہ مخالفین کے کبر وعناد اور باطل تاویلات کے علی الرغم اس عمل کو زندہ رکھیں گے(۲)، اس حقیقت میں بھی کوئی کلام نہیں کہ دنیا میں ظلم وجور کے خاتمے، مغرور حکمرانوں کے استبدادی منصوبوں اور گھمنڈ کو خاک میں ملانے کا کام اسی عمل جہاد کے ذریعے ہی انجام دیا گیا ہے، اسی کی بدولت انسانوں کو امن وسکون نصیب ہوا، اُن کی عزت وآبرو اور جان ومال کا تحفظ ممکن ہوا اور صفحۂ ہستی پر مجاہد حکمرانوں کو غلبہ وتمکن اور عام مسلمانوں کو اعزاز افتخار حاصل ہوا۔ گویا محسن اعظم حضرت محمدؐ کی یہ پیشگوئی درست ثابت ہوئی کہ: یہ دین قائم ہوگا اور زیورات سے لدی پھندی عورت صنعا سے حضرِ موت تک بغیر کسی خوف کے سفر کر سکے گی(۳)۔

* مولانا، کوئٹہ، فاضل مدینہ یونیورسٹی، سعودی عرب برقی پتا: researchjournalpk@gmail.com

تاریخِ موصولہ: ۶ جون ۲۰۱۱ء

مسلمان معاشرے میں غزوہ و جہاد کا شوق اور شہادت کی امنگ ہمیشہ ایمانیات کا مظہر رہے ہیں۔اسی بنا پر سیّدالانبیاءؐ نے خود نہ صرف شہادت کی تمنا کی (۴) بلکہ ایسے شخص کو نفاق سے آلودہ قرار دیا جس کے دل میں کبھی جہاد کی خواہش پیدا نہ ہوئی (۵)، اسی طرح اس مومن کو شہادت کے درجات ملنے کی نوید عطا فرمائی جس کا دل شہادت کی آرزو سے معمور رہا مگر وہ اپنے بستر پر ہی موت سے ہمکنار ہو گیا (۶)، علاوہ بریں آنحضرتؐ نے میدانِ کارزار میں لڑنے والے مجاہدین کی تیاری، انہیں رسد کی فراہمی اور اُن کے اہل خانہ کی ضروریات پورا کرنے والوں کو بھی غزوہ میں شریک قرار دیا ہے (۷)، جہاد کے باب میں یہ حقیقت بھی عیاں ہے کہ نبی رحمتؐ نے اپنی زندگی میں میدانِ جنگ کے لیے جو اصول و قواعد اور اخلاقیات مقرر کیں اُن سے ماقبل اسلام کے وحشی معاشرے قطعی نابلد تھے۔ انسانیت، ہمدردی اور عدل و انصاف پر مبنی انہی ضوابط کا فیضان تھا کہ میدانِ قتال میں بھی دشمنوں کے دل جیتنے کا عمل جاری رہا۔آنحضرتؐ کے صریح ارشادات سے جنگوں میں افراتفری، لوٹ مار، عمومی تباہی، بدعہدی، آتش زنی اور مقتولین کا مثلہ یا انہیں مسخ کر ڈالنے کی سختی کے ساتھ مخالفت فرما دی گئی۔قیدیوں، قاصدوں نیز ہر طرح کے غیر محارب افراد کے قتل سے بھی منع کر دیا گیا اسی طرح کسی کو باندھ کر اذیت ناک طریقے سے قتل کرنے پر بھی پابندی لگا دی گئی (۸)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رائج کردہ یہ آدابِ جنگ آپؐ کی زندگی اور بعد میں خلفائے راشدین کے زمانے میں پوری طرح زیرِ عمل رہے۔ بعد کے ادوار میں بھی بالعموم ان پر عمل ہوتا رہا، چند واقعات میں اگر ان قوانین سے انحراف کیا گیا تو پوری امت نے نہ صرف اُسے غلط جانا بلکہ اُس سے برأت کا اعلان بھی کیا۔

یہ وہ مسلمات ہیں جن کے متعلق فقہائے اسلام سمیت عام افرادِ امت میں کبھی کوئی نزاع پیدا نہیں ہوا۔اسی طرح جہاد کی تعریف، اہداف کے لحاظ سے جہاد کی اقسام، قوت و ضعف اور استطاعت کے اعتبار سے جہاد کے مراتب میں بھی اصطلاحی تنوع کے علاوہ کوئی قابل ذکر اور عملی اختلاف نہیں پایا گیا۔

مسلمانوں کی تاریخ میں جب تک مسلم حکمرانوں نے جہاد کا علم اٹھائے رکھا اور وہ خود مسلمانوں کی سیاسی قیادت کے ساتھ عسکری رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے تب تک حکام اور عوام میں ایک گونہ ہم آہنگی قائم رہی، ظلم و جور کے خلاف جہاد ہو یا جارحیت کے مقابلے میں دفاعی جنگ دونوں طبقوں میں کوئی نمایاں تضاد سامنے نہیں آیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد استعماری تحریک اور مغربی قبضہ گیری کے نتیجے میں ایسی کئی مسلم ریاستیں وجود میں آئیں جن کے حکمران انہی استعماری قوتوں کے نمائندہ اور آلہ کار ثابت ہوئے، انہوں نے نہ صرف اپنے بیرونی آقاؤں کے مفادات کا کھلا تحفظ کیا بلکہ اس طرزِ سیاست کی اصلاح اور ملکی نظام میں اسلام کے نفاذ کی خاطر اٹھنے والی عوامی تحریکوں کو بھی بغاوت قرار دے کر کچلنے میں ذرا دریغ نہیں کیا۔اس وقت اکثر و بیشتر مسلمان ملکوں کی صورتحال اوپر بتائی گئی کیفیت سے کچھ مختلف نہیں، ان کا حکمران طبقہ عوام کے مذہبی جذبات کو پامال کرتے ہوئے معاشرے کی دینی تشکیل میں

رکاوٹیں کھڑی کرتا رہا اور ریاستی امور کو اسلامی تعلیمات کے مطابق کرنے میں کسی صورت تیار نہیں ہوا۔ اس آویزش کے نتیجے میں متعدد مسلمان ملکوں میں نفاذ اسلام کی تحریکوں نے جنم لیا اور حکومتوں سے محاذ آرائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آغاز میں یہ تحریکیں اپنے اہداف کے لیے تبلیغ وعظ، انفرادی تربیت اور عوامی بیداری کے پُرامن ذرائع استعمال کرتی رہیں لیکن رفتہ رفتہ حکومتی جبر وستم کے نتیجے میں بعض لوگوں نے ان مقاصد کے حصول کے لیے ہتھیار اٹھا کر اعلانِ جنگ کر دیا اور اپنے اس طرزِ عمل کو جہاد سے تعبیر کیا۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ آج جب بیشتر متشدد اور مسلح تحریکوں کے قائدین اور دیگر وابستگان غور وفکر اور تجربات کی روشنی میں صلح جوئی اور سیاسی جدوجہد کی طرف رجوع کر رہے ہیں ہمارا وطن پاکستان تشدد اور خونریزی کی دلدل میں پھنستا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم روحِ اسلام اور مقاصدِ شریعت کی روشنی میں اس نئے تناظر کا جائزہ لیں اور اخلاص کے ساتھ دینی رہنمائی کے نکات متعین کریں۔

یہاں چند باتیں بطور اصول ہمارے پیش نظر رہنی چاہئیں۔

اولاً: ہمارا مقصد محض تنقید ونکتہ چینی یا کسی پر اپنی رائے لازم کرنا نہیں بلکہ قرآن وسنت اور مصالحِ دین کی رہبری میں اُس مؤقف کی وضاحت ہے جسے سلف صالحین، مجتہدینِ امت اور اہل اسلام کی اکثریت نے ہمیشہ اختیار کیے رکھا اور وہ شریعت اسلامیہ کے مجموعی مزاج کے بھی موافق رہا۔

ثانیاً: جن موضوعات پر آئندہ سطور میں بات ہوگی ضروری نہیں کہ وہ سراسر نئے ہوں، بلکہ تاریخ وقانون کے ذخائر میں اکثر مسائل کی بنیادیں اور نظائر موجود ہیں، اصل جدت طرزِ استدلال اور انطباق کے مختلف پہلوؤں میں پائی جاتی ہے۔

ثالثاً: عموماتِ قرآن وسنت سے استنباط میں یقیناً ایک سے زائد آراء ہو سکتی ہیں آراء کے تعدد کا وقوع محققین کے نزدیک خود ایک وسعت کو جنم دیتا ہے جو فکر وعمل کے دونوں دائروں میں آزادی اور سہولت کا موجب ہے، اور اجتہادی امور میں شریعت کا منشا بھی یہی ہے۔ آگے آنے والے مباحث میں مختلف آراء کو اسی توسیعی معیار سے جانچیں گے تو تحقیق کے دروازے مزید کھلیں گے۔

حکمِ جہاد کا قانونی مرتبہ

یہ وہ پہلا مبحث ہے جس کے خاصے اثرات آج کی صورت حال پر بہت نمایاں ہیں۔ احکامِ شریعت کی قانونی تقسیم کے لحاظ سے جہاد فقہائے امت کے نزدیک فرض کفایہ ہے، امام وقت کسی وجہ سے لوگوں کو جہاد کے لیے طلب کر لے اور تمام افراد پر شرکت متعین کر دی جائے تو اس کا درجہ فرضِ کفایہ سے بڑھ کر فرضِ عین تک جا پہنچتا ہے، عام طور پر یہ نوبت تب آتی ہے جب مسلمان ریاست پر بیرونی جارحیت واقع ہو جائے یا اُس کے قوی خدشات پیدا ہو جائیں (۹)، امام کے طلب کر لینے کو نفیر عام کی اصطلاح سے بھی یاد کیا جاتا ہے، نیز یہ جنگ اقدامی نہیں بلکہ دفاعی زمرے میں آتی ہے۔ تحقیق سے یہ اندازہ

ہوتا ہے کہ فرضِ کفایہ کی فرضِ عین میں تبدیلی امام المسلمین کے اجتہاد اور صوابدید پر مبنی ہے۔ انفرادی طور پر کسی کو اس قانونی ترمیم کا حق نہیں، آنحضرتؐ کے اسوۂ جہاد سے یہی رہنمائی ہمیں حاصل ہوتی ہے، غزوۂ احزاب کے موقع پر کفارِ قریش کے بڑے حملے کے باوجود نفیرِ عام یا ہر فرد پر جہاد کے تعین کی تصریح نہیں ملتی، جبکہ غزوہ تبوک کے موقع پر دشمن کے ممکنہ حملے کا محض خدشہ ہی پیدا ہوا تھا، لیکن آپؐ نے صراحت کے ساتھ تمام افراد پر شرکت کو لازم فرما دیا تھا۔ ارشادِ خداوندی: یَـآ اَیُّھَـا الَّـذِیْـنَ اٰمَـنُـوْا مَا لَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ انفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ... (اے مومنو! کیا وجہ ہے کہ جب تمہیں اللہ کی راہ میں نکلنے کا کہہ دیا جاتا ہے تو تم زمین سے چمٹ کے رہ جاتے ہو، کیا تم دنیا کی زندگی پر ہی راضی ہو گئے ہو۔۔۔ التوبہ: ۳۸)

اسی طرح آنحضرتؐ کا ارشادِ گرامی: وَاِذَا اسْتُنفِرتُمْ فَانْفِرُوا (الحدیث)

آیتِ کریمہ اور حدیث دونوں سے یہ مفہوم ثابت ہوتا ہے کہ جب تمہیں نکل کھڑے ہونے کا حکم مل جائے تو تم بلا توقف نکل کھڑے ہو۔ علاوہ بریں فقہاء کے نزدیک فرضِ عین جہاد بھی تمام شہریوں پر یکبارگی لازم نہیں (۱۰)، اور نہ ہی ایسا عملاً ممکن ہے، اسی طرح زندگی کے دیگر معمولات کا معطل ہو جانا یقینی ہے اور یہ بات مصلحت کے منافی قرار پاتی ہے (۱۱) چنانچہ **جہاد الاقرب فالاقرب** کے اصول کے مطابق بتدریج کے ہی تمام افراد پر لازم ہوتا ہے۔ بعض اہلِ علم نے فرضِ عین کا یہ مفہوم بھی بیان کیا ہے کہ جہاد ہر مسلمان پر بدن، مال یا زبان و دل کے ساتھ کسی نہ کسی صورت میں ضرور فرض ہے۔ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق مکلّف ہے (۱۲)۔

یہ بات دراصل نبی کریمؐ کی اُس مشہور حدیث مبارکہ کی روشنی میں کہی گئی ہے جس میں آپؐ نے ہر مومن کو انکارِ منکر کے لیے حسبِ طاقت اقدام کی ہدایت فرمائی ہے (۱۳)۔

جہاد اور جدید ریاستی حدود

یہاں دو سوال قابلِ وضاحت ہیں جو دراصل دنیا میں جدید جغرافیائی حد بندیوں، نئے ممالک کی تشکیل اور بڑی قوتوں کے سیاسی غلبے کے نتیجے میں سامنے آئے ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ کیا تمام مسلمان ممالک کا حکم یکساں ہے اور کسی ایک مسلم خطے پر دشمن کی جارحیت کیا یہ تقاضا کرتی ہے کہ دیگر تمام مسلمان بھی اس حملے کے خلاف اُس ملک کے ساتھ مل کر جہاد کریں جو ابتداً جارحیت کا نشانہ بنا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے ہمیں امتِ واحدہ کا درس دیا ہے۔ رنگ و نسل، زبان و علاقے کے فرق کے باوجود ہمیں جسمِ واحد قرار دیا ہے، اس اعتبار سے ایک خطے کا درد پوری اُمت کا مشترک درد قرار پاتا ہے، اگرچہ یہ اصول اپنی آفاقی حیثیت میں قائم و دائم ہے لیکن تیزی سے تغیر پذیر اس دنیا میں یہ تصویر کا محض ایک رُخ ہے، جدید سیاسی معروفات اور عمرانی معاہدات کیا تقاضا کرتے ہیں، اس کا ادراک بھی بہت ضروری ہے۔ ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ دینِ اسلام کا آفاقی اعتقادات اور زندگی کے تمام مراحل میں دائمی انسانی مصالح پر مبنی ہدایات اور قواعد کا مجموعہ ہے، اور ان کے درمیان بہت گہرا رابطہ

موجود ہے۔لازم ہے کہ ہم کو استدلال قائم کرنے سے قبل اسلام کے اس جامع اور عمیق فہم سے بھی استفادہ کریں۔

اسلام نے اجتماعی زندگی کے حوالے سے جو وسیع تعلیمات امت کو عطا کی ہیں اُن کی روشنی میں چند اصول ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

۱۔ اعتقادی رشتے کے باوجود اسلام نے ''شعوب وقبائل'' (۱۴) اور زبان کے اختلاف کا ذکر (۱۵) کر کے گویا نسلی و جغرافیائی اور لسانی تنوع کا اعتراف بھی کیا ہے، اس سے یہ مفہوم اخذ کرنا کچھ بعید نہیں کہ دینی وحدت کی موجودگی میں بھی ہر طبقے کی اپنی حدود ہیں جن کا التزام اسلام کے منافی نہیں۔

۲۔ اسلام میں مسلمانوں کو باہم معاہدات قائم کرنے اُن کی پاسداری کرنے، مختلف معاملات میں شرائط وحدود وضع کرنے اور ان پر قائم رہنے کی واضح ہدایات دی گئی ہیں (۱۶) اس وقت تمام مسلمان ریاستیں بقائے باہمی کے متعدد اصولوں اور معاہدوں کا اقرار کر چکی ہیں۔

۳۔ ''حق الجوار'' یعنی ہمسائیگی کے آداب کا التزام اسلام کا بہت معروف ضابطہ ہے۔ ہمسایوں کو کسی بھی طرح کی ایذا پہنچانا، اُن کی املاک پر تصرف کرنا اور بلا اجازت اُن کی حدود میں داخل ہونا سخت ممنوع عمل ہے (۱۷) ہمسائیگی کا یہ ضابطہ گھروں اور محلوں سے نکل کر بستیوں، شہروں اور ریاستوں تک نافذ العمل ہے۔

۴۔ ایک قیاسی استنباط کی حد تک یہ بات ہمارے عدم مداخلت کے مؤقف کو تقویت بخشتی ہے کہ: قواعد شریعت میں انفرادی ملکیتوں کے تحفظ، اُن میں خارجی تصرف اور دخل اندازی کی ممانعت کا واضح حکم موجود ہے۔ اور یہی تصور اجتماعی ملکیتوں کے احترام میں بھی ایک حجت ہے۔ آج کی دنیا میں الگ الگ ریاستیں بڑی حد تک اجتماعی ملکیتوں کے مماثل ہیں۔ چنانچہ جس طرح ایک گروہ کسی دوسرے کے زیرِ تصرف املاک اور نظام میں دخل اندازی کا مجاز نہیں، بعینہٖ اسی طرح ایک ریاست کے شہری دوسری ریاست کے امور میں بھی مداخلت نہ کرنے کے پابند ہیں۔ یہ معروف قانون آج دنیا بھر میں رائج ہے۔

۵۔ جدید عالمی نظام سے لاکھ اختلاف کے باوجود ہم ''خواہی نہ خواہی'' بہت سے سرحدی قوانین کو عملاً تسلیم کرتے ہیں، بیرون ملک سفر کے لیے ویزے کا حصول، تجارت کے لیے راہداری اور کسٹم کے مطابق فیسوں کی ادائیگی، ہر ملک میں اُس کی مخصوص کرنسی کا استعمال، پاسپورٹ اور شناختی کارڈ کے ساتھ مخصوص شہریت کی پابندی اور دیگر بین الاقوامی قواعد کا التزام، یہ وہ تمام امور ہیں جو مختلف ملکوں کے شہریوں کی حدود کا تعین کر دیتے ہیں۔ اور کوئی ان سے استثناء حاصل نہیں کر سکتا۔

ان مذکورہ اشارات اور آخر الذکر تعامل سے یہی بات قرینِ انصاف معلوم ہوتی ہے کہ عام نوعیت کے معاشرتی اور انتظامی امور میں اگر ان قواعد کا التزام ایک مہذب حیثیت اختیار کر گیا ہے جہاد جیسے نازک اور اہم معاملے کو بھی انہی ضوابط

کی رہنمائی میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ایسا کرنے سے یقیناً معاشرہ بہت ساری آزمائشوں اور فتنوں سے محفوظ رہے گا۔

دوسرا سوال اُن مظلوم مسلمان ممالک میں سامنے آیا جو دنیا کی بڑی طاقتوں کی حرص وطمع اور جارحیت کا شکار ہوئے، ان ممالک کی مزاحم حکومتیں بتدریج ختم کردی گئیں اور نئی کٹھ پتلی حکومتیں قائم کی گئیں جنہوں نے مزاحمت کے بجائے الٹا جارح قوت کی نصرت وحمایت کا فریضہ سنبھال لیا۔تاہم عوامی سطح پر دفاعی جدوجہد بڑے پیمانے پر جاری رہی۔ان ملکوں یا خطوں میں اس جدوجہد کا حکم کیا ہے؟

کچھ دوسرے ممالک میں باقاعدہ فوج کشی تو نہیں کی گئی البتہ جدید عسکری تکنیک کے ذریعے دور ہی سے بعض بے گناہوں پر میزائل اور بم برسائے گئے، جس کے باعث سیکڑوں انسانوں کی ہلاکت اور قیمتی املاک تباہ ہوئیں اور یہ سلسلہ تادمِ تحریر جاری ہے۔ بدقسمتی یہ رہی کہ ان ممالک کے حکمران روزِ اول سے حملہ آور قوتوں کے ہمنوا بنے رہے اور اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے خلاف غیروں سے تعاون کرتے رہے۔

پہلی صورت کی مثال عراق اور افغانستان ہیں، جبکہ دوسری مثال پاکستان اور یمن پر صادق آتی ہے، اور دونوں جگہ جہادی تحریک زوروشور سے جاری ہے۔البتہ افغانستان اور پاکستان اس کا مرکز بن گئے ہیں۔ یقیناً یہ ایک مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔

قرآن وسنت کی تصریحات اور عقل و برہان کی حکمتوں کو پیشِ نظر رکھیں تو بیرونی حملہ آوروں کے خلاف دفاعی جنگ کے جواز اور اُس کے موافقِ قانون ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ برسرزمین دشمن فوجوں کے مراکز، وسیع علاقے میں اُن کی جنگی کارروائیاں، شاہراہوں اور آبادیوں میں مسلسل آمدورفت نہ صرف اشتعال کا باعث ہیں بلکہ اُن کے ساتھ مقابلے و جہاد کو مزید ممکن بنادیتے ہیں، شرعی دلائل پر مستزاد یہی وہ سازگاری ہے جس کی بناء پر افغانستان کے اندر بیرونی جارح فوجوں کے خلاف جاری تحریک جہاد پر کوئی سوال نہیں اٹھ سکتا، ساری پیچیدگی تو پاکستان کے اندر مسلح جہاد برپا کرنے میں مضمر ہے۔ یہاں بیرونی افواج کے مراکز اور تعداد افغانستان کی مانند نہیں، نہ ہی آمدورفت اور زمینی فوجی کارروائیاں نمایاں وجود رکھتی ہیں، جس قدر غیر ملکی فوجی یہاں موجود ہیں اُن کی حفاظت کا بہت منظّم بندوبست پاکستانی حکومت، فوج اور دیگر اداروں کی طرف سے کیا گیا ہے۔ یہ وہ زمینی فرق ہے جو افغانستان اور پاکستان کے درمیان موجود ہے۔ تجزیہ کرتے ہوئے ان عوامل کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

یہ قضیہ دراصل دلائل شریعت سے زیادہ روحِ شریعت سے استفادہ واستنباط کا متقاضی ہے جس میں مصلحتِ انسانی، معاشرتی امن وسلامتی، خونِ مسلم کی حرمت، فتنہ وفساد سے اجتناب اور قانون وعدل کے التزام کی ہدایات پوشیدہ ہیں۔اس تناظر میں پاکستان کے اندر جہادی کارروائیاں ایک نوع کے وجہِ جواز کے باوجود اپنے اصل اہداف تک نہیں پہنچ پاتیں بلکہ ان کی زَد میں عورتوں، بچوں، بوڑھوں کے علاوہ معصوم اور غیر محارب عام افراد آجاتے ہیں، اہل اسلام کی املاک تلف ہوتی ہیں، انتقامی جذبات فروغ پاتے ہیں اور اندھا ردِعمل وجود میں آتا ہے جس سے معاشرے کا سکون وچین غارت ہوکر رہ جاتا

ہے۔ یہ سب چیزیں جہاد وقتال کے اسلامی فلسفے اور اسوۂ نبویؐ سے بالکل مطابقت نہیں رکھتیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاد جیسے عظیم الشان فریضے پر طعن و تشنیع کا دروازہ کھل جاتا ہے اور اُس کی روشن صورت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج منکرینِ جہاد کو یہ موقع مل گیا ہے کہ وہ جہاد کے پاکیزہ نام کو کبھی فساد اور کبھی شدت پسندی اور دہشت گردی جیسی مذموم اصطلاحات سے مطعون کریں۔ قرآن نے تو ہمیں کفار کے معبودان باطلہ کو بھی بُرا بھلا کہنے سے صرف اس لیے منع کر دیا ہے کہ وہ ردعمل میں حقیقی معبود کو گالیاں نہ دیں (الانعام:۱۰۸)۔ جو دین اس قدر حساس اخلاقیات کا حامل ہو اس میں بھلا ایسی کارروائیاں کیونکر روا ہو سکتی ہیں جن کے ردعمل میں شرف انسانیت، خونِ آدمی کے تقدس اور بالآخر شعائر اسلام پر زد پڑتی ہو۔

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس طرح کی کارروائیوں کے نتیجے میں ردعمل دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو حکومتِ وقت پکڑ دھکڑ، قید اور تعذیب کے علاوہ ماورائے انصاف قتل و غارت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیتی ہے جس کی بدولت بلا مبالغہ ہزاروں خاندان متاثر ہو کر نفرت اور انتقام کا مرکز بن جاتے ہیں۔ دوسری طرف شہری آبادیوں میں جہادی کارروائیوں سے جو بے گناہ لوگ ہلاک و زخمی ہو جاتے ہیں اُن کے جذباتی لواحقین بھی ایک غیر مفید ردعملی تخریب کا حصہ بن جاتے ہیں اور پورا معاشرہ جنگ زدہ ماحول کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ آج کے پاکستان کی تصویر اس سے کچھ مختلف نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ گزشتہ صدی کے نصف اول میں تشدد اور مسلح جدوجہد کی طرف جانے والی تحریکیں نہایت تلخ تجربات اور تشنۂ تکمیل اہداف کے باعث پرامن اور دعوتی اسلوب کی طرف رجوع کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں مصر کے شیخ امام شریف، الجزائر کے شیخ رابح الکبیر، شام کے شیخ حسن ہویدی اور تیونس کے شیخ راشد الغنوشی کے بیانات بہت عبرت آموز اور چشم کشا ہیں۔ عالم عرب میں نوجوانوں کی رہنمائی کے لیے ''المراجعات'' اور ''سلسلہ تصحیح المفاہیم'' یعنی دین کی طرف رجوع اور فہم دین کی درستی کے عنوانات سے انٹرنیٹ پر برقی صفحات اور سوال و جواب کا وسیع مواد موجود ہے۔

اسلامی قانون کا مشہور قاعدہ قانون ''دفع المضرۃ اولیٰ من جلب المنفعۃ'' کہ ''نقصان کا دروازہ بند کرنا منافع حاصل کرنے سے زیادہ اہم ہے'' ہمیں یہ رہنمائی فراہم کرتا ہے کہ ہم جائز و ناجائز کی بحث میں پڑے بغیر اپنے حالات و واقعات کا ایک منصفانہ میزانیہ تیار کریں اور اس کے مطابق اپنی عملی ترجیحات کا تعین کریں۔ سیرتِ طیبہؐ کے بعض واقعات ہمیں اسی روشنی سے فیضیاب کرتے ہیں۔

صلح حدیبیہ کے بعد مشہور صحابی حضرت ابوبصیرؓ اپنے محافظ کو قتل کرنے کے بعد فرار ہو کر دوبارہ آنحضرتؐ کی خدمت میں مدینہ پہنچے تو آپؐ نے بے ساختہ فرمایا: وَیلُ اُمِّہٖ مُسعِرُ حَربٍ لَو کَانَ لَہٗ اَحَدٌ۔ (اس کی ماں خسارہ اٹھائے یہ جنگ کے شعلے بھڑکا کے رہے گا، کاش کوئی اس کو سمجھائے)۔

مشہور محقق امام ابن قیم اس واقعہ پر بحث کرتے ہوئے یہ تاثر ظاہر کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ ابوبصیرؓ کو معاہدے کے مطابق شاید دوبارہ مشرکین کے سپرد کرنے والے تھے۔ ابوبصیر آپؐ کا ارادہ بھانپ گئے اور بھاگ کر ابوجندلؓ کے گروہ میں

شامل ہو گئے جو سرِ راہ کفار کے تجارتی قافلوں کو لوٹ لیا کرتا تھا۔ آپ ؐ کو اُن کا یہ عمل شاید دل سے پسند نہیں تھا یا آپ ان کی کارروائیوں کے نقصانات کو امت کے حق میں فوائد سے زیادہ محسوس فرما رہے تھے، اسی بنا پر آپ ؐ نے حضرت ابوجندلؓ اور ابوبصیرؓ کو ایک خط روانہ فرمایا جس میں انہیں اپنی کارروائیاں روک دینے اور تمام ساتھیوں کو اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ جانے کا حکم جاری فرمایا، آنحضرت ؐ کا خط پہنچا تو حضرت ابوبصیرؓ موت کے عالم تھے خطِ مبارک آپ کے سینے پر تھا بعد میں حضرت ابوجندلؓ، ابوبصیرؓ کو دفنا کر تعمیل حکم میں تمام کارروائیاں ترک کر کے آپ ؐ کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہو گئے (۱۸)، یہ واقعہ ہمارے لیے رہنمائی کے بہت سے پہلو رکھتا ہے۔ جن کی طرف ہم گزشتہ سطور میں اشارہ کر آئے ہیں۔

جہاد کی حیثیت، اقدامی یا دفاعی

قرآن پاک کی متعدد آیات اور کئی احادیث جہاد کی اقدامی یا دفاعی دونوں حیثیتوں پر دلالت کرتی ہیں، اسی بنا پر اہلِ تحقیق نے دونوں میں سے کوئی ایک موقف اختیار کرنے کے بجائے اسے حالات وظروف کی نوعیت پر چھوڑ دیا ہے، شریعت کے مزاج کا منشا بھی یہی ہے کہ بظاہر متعارض نظر آنے والے احکامات پر پہلے نسخ یا ترجیح کا اصول لاگو کرنے کے بجائے جمع وتالیف کا اسلوب اپنایا جائے، اگر بعض قوی وجوہ سے جمع ممکن نہ ہو تو پھر نسخ یا ترجیح کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

ہم پہلے جہاد کی قانونی حیثیت پر بات کر چکے ہیں کہ جمہور اہلِ علم کے نزدیک جہاد فرض کفایہ کے حکم میں آتا ہے۔ دراصل اُس کا فرض کفایہ ہونا خود اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اُس کے دیگر پہلوؤں کو بھی امام وقت اور موقع ومحل کے تقاضوں پر موقوف کر دیا جائے ورنہ امت کے لیے سوائے مشقت کے اور کچھ پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً اگر ہم جہاد کے اقدامی ہونے کا فتویٰ جاری کر دیں تو اس وقت مسلمانانِ عالم اقدام تو کیا اپنے دفاع کے بھی قابل نہیں ہیں، حالانکہ دفاعی درجہ، اقدام سے خاصا نیچے ہے۔ ایک طرف اگر جہاد کو اقدامی قرار دے دیا جائے اور دوسری طرف فرضِ عین۔ پھر بھلا بتایئے کہ آج امت کا کتنا حصہ اس فرض سے عہدہ برا ہونے کی پوزیشن میں ہے۔ امت کو اس نوع کی آزمائش میں ڈالنا شریعت کے قواعد اور مجموعی مزاج کے منافی ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (الآية) (۱۹) یعنی تکلیف مالا یطاق اور لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (الآية) (۲۰) کے اصول تو تمام اہلِ علم کے سامنے بہت واضح ہیں۔

جہاد کو اقدامی قرار دینے کا نتیجہ منطقی طور پر یوں برآمد ہو گا کہ معاشرے کا ایک موثر طبقہ مستقلاً مصروفِ جنگ رہے گا اور اس کے انسانی واقتصادی نقصانات سب کو جھیلنے پڑیں گے، اس بارے میں سنت پیغمبر ؐ ہماری کیا رہنمائی کرتی ہے یہ اس حدیث مبارک سے واضح ہوتا ہے۔

ایک بار محاذ جنگ پر دشمن کا انتظار کرتے کرتے کافی دیر ہو گئی تو آپ ؐ نے صحابہ کرام کی بے کلی دیکھ کر اشارہ فرمایا:

لاتتمنوا القاء العدو واسئلو الله العافية فاذ القيتموهم فاصبروا... (دشمن سے بھڑنے کی تمنا مت کرو اور اللہ سے عافیت ہی چاہتے رہو البتہ جب کبھی مڈبھیڑ ہو جائے تو ڈٹے رہو۔۔۔ الحدیث)۔(۲۱)

کیا کفر موجب قتل ہے؟

علمی طور پر اس سوال کی حیثیت اسی قدر رہی ہے کہ یہ فقہ اور اہل تفسیر کے ہاں ایک فقہی مسئلہ کے طور پر زیر بحث رہا ہے۔ آنحضرتؐ، خلفائے راشدین اور مسلم سلاطین کے کفار کے ساتھ تعامل میں کہیں یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ انہوں نے صرف عقیدۂ کفر کو قتلِ کفار کے لیے کافی وجہ قرار دیا ہو۔ ظاہری دلائل بھی اس تعامل کی تصدیق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔

عام طور پر محض کفر کو موجب قتل قرار دینے کا استدلال سورۃ توبہ کی آیت نمبر ۵ سے کیا جاتا ہے۔

فَاِذَا انسَلَخَ الۡاَشۡهُرُ الۡحُرُمُ فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَيۡثُ وَجَدتُّمُوۡهُمۡ وَخُذُوۡهُمۡ وَاحۡصُرُوۡهُمۡ وَاقۡعُدُوۡا لَهُمۡ كُلَّ مَرۡصَدٍ... (پس جب حرمت والے مہینے نکل جائیں تو ان مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کرو انہیں پکڑو اور قید کرو اور ہر جگہ ان کے لیے گھات لگاؤ۔۔۔ التوبۃ ۹:۵)۔

لیکن یہ استدلال خاصا ضعیف معلوم ہوتا ہے۔ جب ہم بالکل اگلی ہی آیت میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو حکم فرمارہے ہیں کہ: ''اگر کوئی مشرک تم سے پناہ طلب کرے تو اُسے پناہ دے دو تا کہ وہ اللہ کا کلام سُن سکے پھر اُسے امن والی جگہ پر پہنچادو''۔ (التوبہ ۹:۶)

اسی طرح سورہ توبہ کی آیت نمبر ۲۹ (قَاتِلُوا الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ : الخ) جس میں کفار سے قتال کو جزیہ ادا کرنے تک محدود کر دیا گیا ہے اور سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۹۰ (وَ قَاتِلُوۡا فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ الَّذِيۡنَ يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ : الخ) جس میں اُن کفار سے لڑنے کا کہا گیا جو خود مسلمانوں سے آمادہ جنگ ہوں پھر اس میں اعتداء اور زیادتی سے بھی منع کیا گیا ہے۔ اور سورہ نساء کی آیت نمبر ۹۰ (فَاِنِ اعۡتَزَلُوۡكُمۡ : الخ) کہ جس میں اُن کفار پر چڑھائی سے روک دیا گیا ہے جو جنگ سے الگ ہو کر صلح وامان کے خواہش مند ہو جائیں، نیز سورہ ممتحنہ کی آیت نمبر ۸ (لَا يَنۡهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ :الخ) جس میں اللہ نے اُن کفار سے حسن سلوک اور نیکی کرنے کا اجازت نامہ جاری فرمایا ہے جو مسلمانوں سے جنگ نہیں کرتے۔

ان قرآنی نصوص کے علاوہ یہ احادیث بھی قابلِ توجہ ہیں کہ رسول اللہؐ نے مجاہدین کو رخصت کرتے ہوئے تلقین فرمایا کرتے تھے کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو کوئی گزند نہ پہنچائی جائے (۲۲)۔ اسی طرح آنحضرتؐ نے غزوۂ بدر کے مشرک قیدیوں کو فدیہ لے کر رہا کر دیا تھا (۲۳)۔ اور نجران کے عیسائی وفد کی مدینہ منورہ میں آپؐ نے خود مہمان نوازی فرمائی تھی۔

یہ بات عقلاً بھی قابل قبول نہیں کہ مطلقاً عقیدۂ کفر کو موجب قتل قرار دے دیا جائے اس طرح تو لازم آئے گا کہ کافروں سے دنیا بھر میں ہر جگہ اور ہر وقت جنگ آزمائی کی جائے، نہ تو اس میں اسلام کی کوئی مصلحت ہے اور نہ ہی انسانیت کے لیے کوئی خیر۔

تکفیر وارتداد کا مسئلہ

آج تکفیر اور ارتداد دونوں اصطلاحیں کفر اصلی یا پہلے سے موجود غیر ایمانی حالت کے لیے نہیں بولی جاتیں بلکہ کسی مومن کو کافر قرار دینے اور اسلام سے پھر جانے کے لیے مستعمل ہے۔اس مسئلے کے بہت سے پہلو اور دائرے ہیں، وہ سب کے سب اس وقت ہمارا موضوع نہیں، البتہ اتنی بات ضرور قابلِ بیان ہے کہ ایک مسلمان معاشرے میں جنگ وقتال کی مشروعیت کے لیے تکفیر، عملی اور نفسیاتی ضرورت ہے کہ مدمقابل فریق کو پہلے کافر یا مرتد قرار دیا جائے پھر اُن کا قتل ہو جانے سے نفس پر کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔ بلکہ قتل کا جواز ہاتھ آ جانے کے بعد عمل میں بھی ایک گونہ آمادگی پیدا ہو جائے گی۔ایک کلمہ گو معاشرے کے بعض افراد کی تکفیر درحقیقت بہت نازک مسئلہ ہے۔اسی بنا پر رسول اللہؐ نے قتال کے جواز کے لیے محض کفر نہیں بلکہ ''کفر بواح'' کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے۔یعنی ایسا واضح کفر کہ جس کے اثبات کے لیے ''برہان'' یعنی ایسی قطعی دلیل بھی موجود ہو جسے رد نہ کیا جا سکے(۲۴)۔

اس بارے میں وہ واقعہ بڑا لرزہ خیز ہے، جس میں حضرت اسامہ بن زیدؓ نے ایک غزوہ میں کلمہ پڑھ لینے کے باوجود ایک شخص کو قتل کر دیا تھا اور آنحضرتؐ کے سامنے یہ توجیہہ پیش کی تھی کہ یا رسول اللہؐ اس شخص نے قتل کے خوف سے تلوار دیکھ کر کلمہ پڑھ لیا تھا۔اس پر آپؐ نے سخت ناراضی ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: ''کیا تم نے اُس کا دل چیر کے دیکھ لیا تھا کہ اُس نے موت کے خوف سے کلمہ پڑھا ہے''۔ پھر آپ عالمِ غضب میں مسلسل یہ فرماتے رہے کہ: ''اُسامہ تم قیامت کے دن آخر کیا کرو گے جب یہ کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ'' تمہارے مقابل آ کے کھڑا ہو جائے گا''۔حضرت اسامہؓ فرماتے ہیں کہ (میں اس جملے کی تکرار اور رسول اللہؐ کا غضب) دیکھ کر یہ تمنا کرنے لگا کہ کاش میں مسلمان نہ ہوا ہوتا(۲۵)۔

علاوہ بریں قرآن نے واضح طور پر صراحت فرمائی ہے کہ: وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ ٥ (جو شخص تمہیں سلام کہے اُسے تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مومن نہیں ۔۔۔ النساء:۹۴)۔

انہی نصوص کی بنا پر فقہا اور اہل علم کی رائے یہ ہے کہ کلمہ گو انسان میں اگر ننانوے احتمالات کفر کے ہوں اور ایک احتمال ایمان کا ہو تو، اُسے مومنین کی قبیل میں ہی شمار کیا جائے گا تا آنکہ حدیث کے مطابق اُس کے یہ احتمالات قطعی دلیل کی صورت میں سامنے آ جائیں۔

فقہا کی یہ بات اس معاملے کی حساسیت اور نزاکت کو واضح کرتی ہے۔اگر یہ بات ٹھیک بھی ہو کہ کچھ افراد یا کسی ادارے کے وابستگان مرتد ہو گئے ہیں، تب بھی بطور سزا اُن کے قتل کا معاملہ اتنا آسان نہیں کہ بغیر قانونی اثبات اور قضا و عدالت کے مختلف گروہ یا افراد کو یہ حق حاصل ہو جائے کہ وہ خود ہی ارتداد کا حکم لگائیں اور خود ہی سزا پر عمل درآمد بھی کر گزریں۔حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ آخرت میں جواب دہی کے اعتبار سے نہایت سنگین عواقب کا حامل ہے۔اللہ رب العزت کا فرمان ہے: وَ مَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُہٗ جَہَنَّمُ خٰلِدًا فِیْہَا وَ غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ لَعَنَہٗ وَ اَعَدَّ

لَـهٗ عَـذَابًـا عَظِيْـمًا o (جس نے کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کیا اُس کی جزا ہمیشہ کی جہنم ہوگی اور اُس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہوگی اور اللہ نے اُس کے لیے بہت بڑا عذاب بھی تیار کر رکھا ہے۔۔۔ النساء:۹۳)۔اتنی سخت وعید کے بعد کس انسان میں یہ ہمت ہوگی کہ وہ محض عمومی اور مبہم وجوہات کی بنا پر کسی مسلمان کو کافر یا مرتد قرار دے اور پھر اُس کے قتل کا ارتکاب بھی کر گزرے۔نعوذ باللہ من ذلک۔

جہاد اور ریاست کی افواج کا باہمی تعلق

ایک زمانہ تھا جب مختلف ریاستوں میں فوج کا ادارہ اپنے تخصص اور ذمہ داری کے لحاظ سے جداگانہ تشخص کا حامل نہیں تھا، کوئی مہم درپیش ہوتی یا جنگ کا موقع آتا تو ہنگامی اور وقتی طور پر فوج کی تشکیل عمل میں لائی جاتی۔ رفتہ رفتہ افواج کا ادارہ دیگر اداروں کی طرح منظّم ہوگیا اور یہ ضابطہ مہذب تمدن کی علامت بن گیا کہ ہر ادارہ اپنی خاص صلاحیت اور میدانِ کار تک محدود رہے اور کوئی کسی دوسرے کے امور میں مداخلت نہ کرے۔ ہر شعبے اور ادارے کے ملازمین کے لیے باقاعدہ تنخواہیں اور مراعات مقرر کر دی گئیں اور یہ معاہدہ طے پایا کہ ہر ملازم تفویض کردہ ذمہ داری کی ادائیگی پر ہی تنخواہ اور دیگر سہولیات کا حق دار ہوگا۔

اس بارے میں فقہا اور علمائے عمرانیات کی آراء کا خلاصہ مشہور مجتہد شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

جہاد بالعموم مسلمانوں کے لیے واجب کفایہ ہے، تاہم یہ اُن مخصوص لوگوں پر لازم ہو جاتا ہے جنہیں بیت المال سے اس کام کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اُن پر شرعاً اور اس معاہدے کی رو سے یہ واجب ہوتا ہے جو اُن کے اور حکام بالا کے درمیان منعقد ہوا ہے۔ اگر یہ جہاد اُن پر ازروئے شرع و معاہدہ نہ بھی لازم ہوتا تب بھی اُس تنخواہ کے عوض ضرور ہی واجب ہو جاتا، یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ جس طرح ایک مزدور پر اجرت کے بدلے خدمت واجب ہو جاتی ہے یا کسی چیز کی قیمت ادا کر دینے پر اُس چیز کی ادائیگی ضروری ہو جاتی ہے۔ تنخواہ کے عوض رضامندی کے ساتھ فوجی ذمہ داری قبول کر لینا گویا عوام کو یہ ضمانت دینے کے مترادف ہے کہ دشمن سے جنگ اور دفاع اب فوج کی ذمہ داری ہے، اس کے بعد یہ فوجی اگر غفلت، کوتاہی اور پیشہ ورانہ امور پہلوتہی برتیں گے تو مسلمانوں کو دینی اور دنیاوی مالی اور جانی اعتبار سے ایسا نقصان پہنچانے کے مرتکب ہوں جس کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا (۲۶)۔

اس شرعی، اخلاقی اور رائج الوقت مہذب قانون کا تقاضا ہے کہ ریاست کی افواج جہادی منصب، سرحدوں کی نگرانی اور دشمنوں سے نمٹنے کا فریضہ پوری تن دہی کے ساتھ ادا کریں، یہ اُن کے منصب اور اس حلف کا بھی تقاضا ہے جو انہوں نے عوام کے روبرو اٹھایا ہے۔ اس مسئولیّت میں کوتاہی دراصل متعدد خرابیوں کو جنم دیتی ہے۔

پہلی یہ کہ: ریاست کی دشمنی بیرونی افواج اور دیگر شر پسندوں کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ سرحدوں پر فتنہ وفساد کی آگ بھڑکائے رکھیں، بلکہ ریاست کے اندر تک پہنچ کر تخریبی کارروائیاں کر گزریں۔

دوسری یہ کہ: ریاست کے اندر کچھ جوشیلے اور جذباتی طبقات کے اندر یہ اکساہٹ پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ فوج کی غفلت کشی کو جواز بنا کر اُن کا جہادی منصب خود سنبھال لیں۔

تیسری یہ کہ: اس طرح کے مخلص اور بے لوث رضا کار مہیا ہوجانے کی صورت میں خود فوج کے اندر آرام طلبی اور عیش کوشی کا داعیہ پروان چڑھتا ہے، وہ خود سرحدوں پر دشمن سے نبرد آزما ہونے کے بجائے انہی رضا کار نوجوانوں کو استعمال کرتی ہے۔

چوتھی خرابی یہ واقع ہوتی ہے کہ سول معاشرے میں بھی ایک نوع کی عسکریت پسندی کا مزاج پیدا ہوجاتا ہے، اسلحے کی فراوانی اور جا و بے جا اُس کی نمائش اور استعمال سے عام انسانوں میں خوف اور دہشت کی فضا قائم ہوجاتی ہے۔

یہ وہ چند اہم خرابیاں ہیں جن کی یہاں نشاندہی کی گئی ہے ورنہ تہہ در تہہ مضر نتائج کی فہرست بہت طویل ہے۔ آج ہمارا پاکستانی معاشرہ اسی بدنظمی کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔

کیا آج پاکستان میں جہاد فرضِ عین ہوگیا ہے؟ یہ سوال بھی اسی وجہ سے سامنے آیا ہے کہ جس ادارے پر ضابطے و قانون، معاہدے اور حلف کے نتیجے میں جہاد لازم ہوا ہے وہ نہ صرف اس سے غافل ہے بلکہ اُلٹا جارح قوت کی ہم رکابی کر رہا ہے۔ یہی وہ عملی تضاد اور اپنے فرائض کی عدم ادائیگی سے پیدا ہونے والا خلا ہے جسے پُر کرنے کے لیے کچھ اور غیر فوجی قوتیں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں اور فرضِ عین کی خاص تشریح کے ساتھ سرگرم ہوگئی ہیں۔

خروج اور بغاوت

تجربہ شاہد ہے کہ کسی ریاست کے اندر اس طرح کی عسکریت پسندی کا فروغ وقت اور حالات کے تغیر کے ساتھ کئی رنگ بدلتا ہے اور ان مسلح گروہوں کی جدوجہد بالآخر اندرونی اصلاح یا نفاذِ اسلام کے عنوان سے حکومت اور اس کے اداروں کے خلاف جنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے، مسلح تنظیمیں اپنے عمل کو جہاد کہتی ہیں اور مخالف حکومتیں اسے خروج یا بغاوت سے تعبیر کرتی ہیں۔ یہ موضوع خاصی وسعت کا حامل ہے اور اس وقت براہِ راست ہمارا ہدف نہیں، البتہ ہمیں اتنی بات ضرور جاننی چاہیے کہ سیاستِ شرعی کے اعتبار سے حکومت عادلہ اور حکومت فاسقہ کا فرق ملحوظ رکھنا قرین انصاف ہے۔ اگر حکومتوں کی نوعیت الگ الگ ہے تو ان کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کا حکم بھی یکساں نہیں ہوسکتا، ضروری نہیں کہ ہر حکومت مخالف مہم خروج یا بغاوت کے زمرے میں شامل کی جائے جس طرح یہ لازمی نہیں کہ ہر تحریک، جہاد کہلانے کی مستحق ہو۔

یہ فرق ہمیں خلافتِ راشدہ اور بعد کی حکومتوں میں پیش آنے والے واقعات میں بخوبی نظر آتا ہے۔ فی الوقت یہ مبحث تحقیق طلب نہیں کہ ہم ان تحریکوں کے جواز اور عدم جواز کے دلائل میں الجھ جائیں، بلکہ اصل منشا یہ واضح کرنا ہے کہ اس طرح کی کوششوں کا ضرر ہمیشہ منافع کے مقابلے میں بہت زیادہ رہا ہے۔ شورش و انتشار، بدامنی و خوف اور جان و مال کی ہلاکت کا تحفہ ہی سماج کے حصے میں آیا ہے۔ آج کی حکومتیں جدید وسائل اور منظم اداروں کی بدولت ماضی کے مقابلے میں

زیادہ مضبوط اور سفاک ہوگئی ہیں۔ معاشرے میں مستقلاً بے چینی اور افراتفری شریعت کا مطلوب نہیں، نہ ہی یہ کیفیت دعوت کے لیے سازگار ہے جو فی الواقع انبیا کا مشن رہا ہے۔ ہمارا مقصود جہاد کے بارے میں پست ہمتی پیدا کرنا نہیں بلکہ کتاب وسنت کی روشنی میں مواقع کے لحاظ سے قوت کے استعمال کی حکمت عملی کو واضح کرنا ہے۔ سورۃ النحل میں اللہ رب العزت کے ارشاد گرامی کا مفہوم بھی یہی نظر آتا ہے۔ حکم ہوتا ہے: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ... (اے نبی اپنے رب کی طرف دانائی اور خوبصورت نصیحت کے ذریعے بلاؤ اور لوگوں کے ساتھ بہترین اسلوب سے مباحثہ کرو۔۔۔ النحل: ۱۲۵)۔

اور نبی کریمؐ کا یہ ارشادِ مبارک بھی ہمیں غور وفکر کی دعوت دے رہا ہے، آپؐ نے فرمایا:

اَفْضَلُ الْجِهَادِ کَلِمَةُ حَقٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَابِرٍ... (سب سے افضل جہاد ظالم حکمران کے سامنے سچی بات کہنا ہے)۔(۲۷)

حضرت عبداللہ بن زبیر کا اموی حکومت سے تنازعہ شروع ہوا تو کچھ لوگوں نے حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس حاضر ہو کر انہیں اس فتنے کے خلاف لڑنے کا مشورہ دیا، ساتھ ہی آیت مبارکہ وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (البقرۃ۲:۱۹۳) کا حوالہ بھی دیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس موقع پر ایک نہایت پُر حکمت بات کی، فرمایا:

”ہم نے آنحضرتؐ کے ساتھ جہاد کیا، یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہا اور دین پورے کا پورا اللہ کے لیے ہوگیا، اب کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم آپس میں لڑیں، تاکہ فتنہ پیدا ہو اور دین غیر اللہ کا ہوجائے“۔(۲۸)

جہاد کی شرائط کا مسئلہ

جہاد کے ضمن میں جن چیزوں کا بطور شرائط تذکرہ کیا جاتا ہے وہ کسی آیت قرآنی یا کسی حدیث نبوی میں ایک دو تین کی ترتیب سے بیان نہیں ہوئیں بلکہ جہاد کے متعلق کتاب وسنت کے وسیع بیانات سے ماخوذ ہیں، پھر یہ شرائط مصالحِ انسانی، معاشرتی آداب، سماجی نظم وضبط اور عقل وخرد کے بارے میں اسلامی بنیادوں سے بالکل موافق ہیں۔ اسی بنا پر ان کے باقاعدہ منصوصِ قطعی نہ ہونے کے باوجود فقہائے امت ان کا تذکرہ کرتے چلا آرہے ہیں۔ تمام جزئی شرائط کا بیان نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی اُن کے جائزے کی کوئی حاجت، عام طور پر فی زمانہ دو چیزیں زیادہ سوالات کا مرکز ہیں:

۱۔ اطاعتِ امیر یا جہاد کے لیے نظام امارت کا ہونا۔

۲۔ والدین کی اجازت اور دیگر اہل خانہ کی رضامندی۔

اطاعتِ امیر

اطاعت امیر یا امام کی اجازت و رضامندی کی شرط میں شاید کوئی نزاع نہ ہونا، لیکن بدقسمتی سے آج آصف علی زرداری، حامد کرزئی، نور المالکی اور محمود عباس جیسے لوگ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے ”امیر المومنین“ کے منصب پر براجمان ہیں۔ مسلمان عوام ظلم وستم اور عدوان کا شکار ہو رہے ہیں اور یہ امیر المومنین حضرات چپ سادھے بیٹھے ہیں، بلکہ

یہ اس تعدی میں برابر کے شریک ہیں۔ یہ وہ نیا منظر ہے جس میں مذکورہ شرط کا سوال ایک نزاع کی شکل میں سامنے آ گیا ہے۔ کچھ لوگ تو اب اسے یکسر ضروری نہیں سمجھتے جبکہ کچھ دوسرے محض اپنے گروہ کے ''امام'' یا ''امیر'' کی اجازت کو ہی کافی سمجھتے ہیں اور شاید کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس شرط کے سرا سر قائل ہی نہیں۔

ہمارے خیال میں یہ تینوں موقف مقاصد دین، مصالح شرعی اور اس شرط کی تہہ میں پائے جانے والے انسانی مضمرات سے ناواقفیت کی عکاسی کر رہے ہیں۔

ذرا غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ شریعت اسلامیہ نے معمولی درجے کے انسانی امور میں بھی نظم وضبط کو بہت اہمیت دی ہے، حتیٰ کہ تین مسافروں کو خالی صحرا میں بھی اپنے اوپر ایک کو امیر مقرر کرنے کا حکم دیا ہے(۲۹) عقلِ عام تقاضا کرتی ہے کہ جب ایک چھوٹی سی جماعت کے لیے یہ ضروری ہے تو کسی بڑی جماعت کے لیے تو بالاولیٰ لازمی ہوگا کہ وہ اپنا کوئی امیر مقرر کریں۔ اسی طرح یہ بات بھی بہت واضح ہے کہ اگر سفر جیسے عام معاملے میں نظام امارت ضروری ہے تو جہاد جیسے نازک شعبے میں کیونکر امارت کی ضرورت نہ ہوگی۔ حالانکہ میدانِ جہاد میں انسانی جان و مال داؤ پر لگا ہوتا ہے جگہ جگہ پر خونریزی کا امکان اور ہر لحہ موت کا خدشہ بالکل سامنے ہوتا ہے۔ میدانِ جہاد میں امارت کے ترک اور اطاعت کے فقدان سے ہولناک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اس بارے میں غزوۂ احد کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

اسی بنا پر رسولِ خداؐ نے ہدایت فرمائی ہے: اِنَّمَا الاِمَامُ جُنَّةٌ يُقَاتَلُ مِنْ وَرَائِهِ وَيُتَّقٰى بِه... (کہ امام درحقیقت میدانِ جنگ میں ایک ڈھال کی مانند ہوتا ہے، جس کی پناہ میں لڑا جاتا ہے اور اُسی کی وجہ سے نقصانات سے بچا جاتا ہے۔۔۔صحیح البخاری: ۲۹۵۷)۔ (۳۰)

ایک اور حدیث میں، آپؐ نے غزوات کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں، پہلی اطاعت امیر کے زیر سایہ، اس قسم کو فساد سے دور اور بڑے اجر کی حامل بتایا ہے۔ دوسری قسم نظام اطاعت کے بغیر جسے فساد فی الارض اور بے مایہ قرار دیا ہے(۳۱)۔

کسی گروہ کا صرف اپنے امام کی اجازت اور اطاعت کو کافی سمجھ لینا بھی درحقیقت شریعت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ الگ الگ امراء کے تحت مختلف گروہوں کے جہادی پروگرام پر نیک نیتی کے حوالے سے کوئی شک یا گمان نہیں کیا جا سکتا، مگر یہ چھوٹی چھوٹی وحدتیں مجاہدین کو اُس آفت سے بچانے کی چنداں صلاحیت نہیں رکھتیں جسے حدیث بالا میں فساد قرار دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بارہا ان گروہوں کے مابین آپس میں جنگ وقتال اور خونریزی کے کرب ناک مناظر دیکھ چکے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی تھما نہیں بلکہ کئی خطّوں میں مسلمانوں کے مابین جاری ہے۔ اس فساد اور فتنے سے تحفظ ہی دراصل وہ حکمتِ نبوی ہے جس کی طرف احادیث میں اشارہ کیا گیا ہے اور جس کی وجہ سے فقہائے دین نے ایک جامع نظام امارت کی شرط کا ذکر کیا ہے۔

والدین کی اجازت

والدین کو خاندان میں سب سے زیادہ اہمیت اور احترام کا مقام حاصل ہے۔ انہی کی اطاعت اور فرماں برداری سے معاشرت کا نظام چلتا ہے۔ غالبًا اسی لیے ان کی خوشی میں رب کی خوشنودی بتائی گئی ہے(۳۲) ایک سے زائد احادیث میں جہاد کے لیے والدین کی رضامندی کو ضروری قرار دیا گیا ہے یا اُن کی خدمت کو جہاد پر ترجیح دی گئی ہے۔(۳۳)

اسی طرح ایک حدیث مبارکہ میں ایک ایسے صحابیؓ کو جو کسی غزوہ کے لیے اپنا نام لکھوا چکے تھے جہاد پر جانے سے اس لیے روک دیا گیا کہ اُس کی بیوی کے ساتھ حج پر جانے والا کوئی نہیں تھا۔(۳۴)

ان احادیث میں ماں، باپ اور بیوی کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے، یہ تینوں معاشرے کی بنیادی اکائیاں ہیں، ان کے تذکرے سے دراصل شریعت کے اس رُخ کا اندازہ ہوتا ہے تاکہ اُس میں سماجی حقوق کی بجا آوری کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ آنحضرتؐ نے اس بات کو پسند نہیں فرمایا کہ جہادی سفر کی وجہ سے افرادِ خانہ کے معمولات اور زیرِ کفالت لوگوں کی ضروریات متاثر ہوں۔

اگرچہ فقہا نے جہاد کے فرضِ عین ہونے کی صورت میں والدین کی اجازت کے حکم کو مستثنیٰ قرار دیا ہے، لیکن فرضِ عین کی تفصیل میں ہم پہلے بتا آئے ہیں کہ وہ بھی یکبارگی سب پر متعین نہیں ہوتا۔(۳۵)

اس لحاظ سے والدین کی اجازت، حقوق کی ادائیگی اور دیگر اہل خانہ کی کفالت کے مؤثر انتظام کے بغیر جہاد کے سفر پر جانا بہر حال کئی عوارض کو جنم دیتا ہے۔ جمہور اہل علم نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور اسی میں خیر کا پہلو مضمر ہے۔ یہ عمل پوری تیاری، اہل خانہ کی رضامندی اور مکمل شرح صدر کے ساتھ کرنا ہی مفید ہے۔ دینِ اسلام کا درست شعور بھی یہ تقاضا کرتا ہے کہ مختلف حقوق کی ادائیگی میں افراط وتفریط کے بجائے اعتدال اور توازن کے اصول کو اپنایا جائے۔

اسلام کا یہ فہم کہ ایک حق کی ادائیگی کے لیے لاچار کئی حقوق وفرائض کو ساقط کر دیا جائے، دین کے صحیح شعور کی غمازی نہیں کرتا۔ پھر یہ معاملہ یوں زیادہ اہم ہو جاتا ہے کہ اس طرح والدین، بیوی، بچوں اور دیگر اقارب کو چھوڑ کر چلے جانا دراصل حقوق العباد میں بہت بڑی کوتاہی اور نقص کو جنم دیتا ہے۔ آخرت میں ایک فرض کفایہ سے رخصت تو شاید مل سکے لیکن بندگانِ خدا کے واجب حقوق سے چھوٹ ملنا بہت مشکل ہے۔

خَدُعَۃ اور جہاد

خدع کا مفہوم ارادۂ قلب کے برخلاف رائے کا اظہار ہے تاکہ مخاطب غلط فہمی اور شک میں مبتلا ہو جائے، اس اعتبار سے یہ تقیہ اور توریہ کے قریب المعنی ہے، حیلہ سازی اور چال چلنا اس کے مفہوم میں شامل ہیں، تاہم یہ واضح ہے کہ بدعہدی، دغا وفریب، غلط بیانی اور عرف عام کی بے ایمانی اس میں داخل نہیں۔ خدع کی جو شکل بھی ہو وہ حالت جنگ اور کفار کے برخلاف ہی جائز ہے۔ مسلمانوں کے معاشرے میں اس کا جواز تلاش کرنا ایسے ہی ہے جیسے کسی حرام چیز کو حلال کرنا، مشاہدہ ہے کہ آج جس طرح کفر کا دائرہ بہت پھیلا دیا گیا ہے اسی طرح ''جنگ'' اور ''خدع'' کے مفہوم کو بھی بہت وسعت دے

دی گئی ہے۔ اور اسے میدان جہاد سے لے کر شہری آبادیوں کے اندر ہونے والی کارروائیوں اور خبروں اور رپورٹوں میں بھی داخل کرلیا گیا ہے۔ اسلام کی جنگی اخلاقیات میں اس کا جواز کس حد تک ہے ہر قلبِ سلیم اس کا فیصلہ بخوبی کرسکتا ہے۔(۳۶)

افغانستان میں روس اور امریکا کے خلاف جہاد کی نوعیت؟

یہ سوال بہت سے حلقوں میں زیر بحث رہتا ہے کہ پاکستان کی مختلف دینی جماعتوں نے افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف تو کھل کر جہاد میں حصہ لیا، لیکن یہی جماعتیں اب امریکی یلغار کے خلاف جہاد سے کیوں کترا رہی ہیں؟ خاص طور پر یہ سوال جماعت اسلامی کے بارے میں زیادہ جوش سے پوچھا جاتا ہے کیونکہ ماضی میں جماعت اسلامی نے کمیونزم کے خلاف خاصا سرگرم کردار ادا کیا تھا۔

یہ سوال جذبات اور گرم جوشی کے تناظر میں شاید بہت صائب معلوم ہو، لیکن زمینی حقائق امکانات اور بین الاقوامی حالات کو مدنظر رکھیں تو اس میں حقیقت کا ادراک اور مشاہدے کی گہرائی نظر نہیں آتی۔ ہم چند سطور میں اُن اسباب اور عالمی سیاسی مضمرات کی روشنی میں اس سوال کا جائزہ لیں گے جنھیں اس میں ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ گزشتہ صدی میں افغانستان پر روس کی یورش اور رواں صدی کے اوائل میں امریکی حملے کے درمیان فکر و نظر کا کوئی اختلاف نہیں۔ نہ ہی شرعی، انسانی اور اخلاقی اعتبار سے دونوں کی جارحیت سے کوئی جوہری فرق ہے، نہ ہی بین الاقوامی سیاسی دباؤ کے باعث روس سے نفرت اور امریکا سے محبت کا کوئی کردار نبھایا گیا ہے، البتہ جو عوامل فی الواقع کارفرما رہے ہیں ان کی وضاحت ذیل میں پیش کی جا رہی ہے۔

روس کے خلاف جہاد کی خصوصیات:

۱۔ مسلمانانِ عالم کو طویل برسوں سے جہاد کا اتنا وسیع اور مقبول میدان میسر نہیں آیا تھا، چنانچہ دنیا کے گوشے گوشے سے جہاد کا شوق رکھنے والے اُمڈتے چلے آئے اور انہیں اپنی تشنگی دور کرنے کا موقع مل گیا۔

۲۔ افغان جہاد کو روس کی پسپائی تک زبردست عالمی حمایت اور اقوام متحدہ کی تائید حاصل رہی جس کی بدولت ہوا کا رُخ موافق رہا اور پھر پرواز کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

۳۔ افغان مجاہدین کے لیے نجی و حکومتی دونوں سطح پر مالی مصارف کی فراہمی ایک کار معروف کی طرح جاری رہی اور پوری دنیا کے مسلمانوں نے خطیر رقومات اور گراں قدر عطیات بغیر کسی قدغن کے مجاہدین کو مہیا کیے۔

۴۔ افغان جہاد کے دوران ''انتہا پسندی''، ''بنیاد پرستی'' یا ''دہشت گردی'' کے عنوان سے کوئی منفی پروپیگنڈا سامنے نہیں آیا، بلکہ جہادی اصطلاحات اور ماحول کو فروغ دیا گیا۔

۵۔ حکومت پاکستان کی سرکاری پالیسی افغان جہاد کی تائید و نصرت قرار پائی، چنانچہ پاکستان اس جہاد کی افرادی، مالی اور عسکری کمک کا مرکز بن گیا اور یہ عمل باقاعدہ حکومتی سرپرستی میں جاری رہا۔

۶۔ افغانستان میں روس کی ہزیمت تک دو بڑی تنظیمیں حزب اسلامی اور جمعیت اسلامی مجاہدین کو موثر قیادت فراہم کرتی

رہیں اور باہمی طور پر کوئی تنازعہ قتل ومقاتلے تک نہیں پہنچا۔ دیگر چھوٹی تنظیمیں بھی اتحاد کا مظاہرہ کرتی رہیں۔

۷۔ ایک جنگ زدہ ملک کی عام آبادی کے لیے محفوظ پناہ گاہوں کا مسئلہ بہت اہم ہوتا ہے۔ افغانستان کے دو ہمسایہ ملکوں پاکستان اور ایران نے مہاجرین کے لیے اپنی سرحدوں کے دروازے کھول دیے، چنانچہ مجاہدین اس جانب سے مطمئن ہوکر دل جمعی سے میدان میں ڈٹے رہے۔

یہ وہ چند اہم اور بنیادی امتیازات ہیں، جن کی وجہ سے افغان جہاد میں کچھ ایسی سازگاری پیدا ہوگئی جس نے شوق و جذبے کو مزید مہمیز کر دیا اور گھر سے لے کر میدانِ جہاد تک کے تمام مراحل نہایت آسودہ اور آسان ہو گئے، حکومتی سرپرستی اور عالمی موافقت کی بدولت کوئی نظری اور نفسیاتی الجھن بھی سامنے نہیں آئی، بلکہ افغان جہاد میں شرکت ایک اجتماعی ہدف بن گیا۔ بدقسمتی سے آج ان میں سے کوئی ایک عامل بھی برسرزمین وجود نہیں رکھتا۔ بلکہ قدم قدم پر رکاوٹیں قید و بند اور تعذیب، اچانک اغوا اور گمشدگی، نفسیاتی پروپیگنڈا، سرحدوں کی بندش اور انتظامی و مالی امور پر پابندی جیسے شدید اقدامات دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ اب یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ پہلے جیسی سرگرمیاں فطرتاً ممکن نہیں، نہ اس غرض سے پوری دنیا میں نقل وحرکت کوئی آسان کام رہ گیا ہے۔ لہٰذا زیرِ بحث سوال کا تعلق جذبۂ جہاد میں کمزوری، شوق شہادت کی کمی یا اس بارے میں نیک نیتی اور اخلاص کے ضعف سے نہیں، بلکہ اوپر بیان کیے گئے حالات کا فقدان اس کا بنیادی سبب ہے۔ مطلوب سازگاری اب میسر نہیں اور سہولت کے بجائے سختی روزافزوں ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ یہ عزیمت کے بجائے رخصت کا راستہ ہے، ہمیں تسلیم ہے کہ یہ وہ عزیمت نہیں جس کا تصور معترضین نے اپنے ذہنوں میں بسا رکھا ہے، یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ رخصت وعزیمت کا کوئی طے شدہ معیار شریعت نے مقرر نہیں کیا۔ ہر آن کوئی چیز کسی ایک کے لیے رخصت اور دوسرے کے لیے عزیمت ہوسکتی ہے۔ انسانی صلاحیتوں کا فرق، استطاعت اور قوت کا تفاوت، حالات کا جبر یا آسانی اور امکانات کا وجود اس میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اور حکم شرعی میں تبدیلی کا مواد انہی حقائق پر قائم ہے۔

پھر یہ پہلو بھی نظرانداز کرنے کے لائق نہیں کہ آج پوری استقامت کے ساتھ گوامریکا گومہم اور امریکی جارحیت کے خلاف وسیع پیمانے پر عوامی بیداری بھی آج کی عزیمت ہے، پورے فلسفۂ جہاد کا تحفظ، دنیا بھر میں مجاہدین کی معنوی نصرت وحمایت بھی آج کسی امتحان سے کم نہیں، مراکز سیاست کی اصلاح اور اسلام کے فلاحی تصور کا احیا خود ایک جہاد اور ابتلا کا حکم رکھتا ہے۔ آج جب مسلم حکمران، ملک کی بڑی بڑی سیاسی جماعتیں امریکا سے مرعوب اور اُس کے سامنے منقار زیر پر ہیں، ایک جماعت اسلامی ہی ہے جو حکمت کے ساتھ جدید استعمار کو چیلنج کرنے کا فرض ادا کر رہی ہے۔ جماعت کا اختیار کردہ یہ اسلوب طویل اور صبر آزما سہی لیکن ان شاء اللہ پائیدار و مستحکم نتائج کا حامل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں فہم شریعت اور نورِ ہدایت سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

مراجع وحواشی

(۱) صحیح بخاری حدیث نمبر ۱۵۱۹۔ صحیح مسلم حدیث ۱۲۷۱ (۲) سنن ابوداؤد ۲۱۷۰ (۳) صحیح بخاری ۳۵۹۵

(۴) صحیح بخاری ۲۷۹۷۔ (۵) صحیح مسلم ۱۹۱۰ (۶) ایضاً ۱۹۰۹، نیز سنن ابوداؤد ۱۵۲۰

(۷) صحیح مسلم ۱۸۹۵، نیز سنن ترمذی ۱۶۲۸ (۸) سنن ابوداؤد ۲۶۶۷، ۵۲۶۸۔ صحیح بخاری ۲۹۹۵، ۲۳۴۲/سنن دارقطنی ۳/۶۰

(۹) مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲۸، ص ۱۸۵، ۱۲۶/ فتح الباری ج ۶، ص ۳۷/ فقہ الجہاد، شیخ تاج عروسی، آ سار الحرب، وھبہ زحیلی

(۱۰) حاشیہ ابن عابدین ج ۳، ص ۲۴۰/ فقہ السنۃ ج ۳، ص ۱۱ (۱۱) ایضاً

(۱۲) فتح الباری ج ۶، ص ۳۷، مجموع فتاویٰ حوالہ سابق (۱۳) صحیح مسلم ۴۹، سنن ابوداؤد ۱۱۴۰، سنن ترمذی ۲۱۷۳

(۱۴) سورۃ الحجرات: ۱۳ (۱۵) سورۃ الروم: ۲۲ (۱۶) سورۃ المائدہ: ۱، سنن ابوداؤد ۳۵۹۶، معجم کبیر طبرانی ۱۳۵۰۷

(۱۷) سورۃ النساء: ۳۶، صحیح مسلم ۴۶ (۱۸) زادالمعاد از ابن قیم ج ۳، ص ۲۸۳

(۱۹) سورۃ البقرہ: ۲۸۶، سنن ابوداؤد ۲۶۱۴ (۲۰) ایضاً: ۲۵۶ (۲۱) صحیح بخاری ۳۰۲۵

(۲۲) صحیح بخاری ۲۸۵۲ (۲۳) مصنف عبدالرزاق ۹۷۲۸ (۲۴) صحیح مسلم ۱۷۰۹

(۲۵) ایضاً حدیث نمبر ۹۷ (۲۶) مجموع فتاویٰ ج ۲۸، ص ۵۸۱ (۲۷) سنن ابوداؤد ۲۶۰۸

(۲۸) سورۃ البقرہ: ۱۹۳، صحیح بخاری ۴۳۱۳ (۲۹) سنن ابوداؤد ۲۶۰۸ (۳۰) صحیح بخاری ۲۹۵۷

(۳۱) سنن ابوداؤد ۲۵۱۵، سنن نسائی ۳۱۸۸ (۳۲) مستدرک حاکم ۲۴۸۷ (۳۳) صحیح مسلم ۴۹، ۲۵ سنن ابوداؤد ۲۵۲۹

(۳۴) صحیح بخاری ۲۰۰۶، معرفۃ السنن للبیہقی (۳۵) بدائع الصنائع ج ۷، ص ۹۸

(۳۶) فتح الباری ج ۶، ص ۱۵۸/ الجہاد فی الاسلام (۳۷) ایضاً، ص ۵۵۷

نوٹ: مصادر سے استفادے میں الفاظ کے بجائے مفہوم کا لحاظ کیا گیا ہے۔